تزکیۂ نفس

تزکیۂ علم — علمِ حقیقی کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے

[میری زیرِ ترتیب کتاب "تزکیۂ نفس" کی دو ابتدائی فصلیں جو مقدمۂ کتاب کی حیثیت رکھتی ہیں ترجمان بابت فروری و مارچ ۱۹۵۳ء میں نکل چکی ہیں۔ اس کے بعد میرے گرفتار ہو جانے کے سبب سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اب یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے توفیق اور فرصت نصیب ہو۔

اس کتاب کو جیسا کہ میں نے اس کے مقدمہ میں واضح کر دیا ہے میں نے تین بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں تزکیۂ علم سے متعلق مباحث ہیں، دوسرے میں تزکیۂ عمل کی تفصیلات ہیں اور تیسرے میں تزکیۂ تعلقات و معاملات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون جو ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے کتاب کے پہلے باب (تزکیۂ علم) کی پہلی فصل ہے ۔ امین احسن اصلاحی]

علم کے تزکیہ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصراً یہ بتائیں کہ حقیقی علم ہے کیا اور اس علم کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا ہیں۔

علم خواہ کسی معمولی سے معمولی بات کا بھی ہو بہرحال علم ہے اور وہ جہل کے مقابل میں انسان کو فطرتاً عزیز و مرغوب ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس علم کی پیاس انسان کے اندر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے، جس علم کو وہ سب سے پہلے ڈھونڈھتا ہے اور جس علم کو وہ دوسرے تمام علموں پر ترجیح دیتا ہے یہ علم محض اس کائنات کے چند طبیعی قوانین و ضوابط کے جان لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم چند مابعد الطبیعی سوالات کے اطمینان بخش حل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوالات اگرچہ مابعد الطبیعی ہیں اگرچہ ان سوالات کا تعلق انسان کے بالکل قریبی ماحول سے براہِ راست نہیں ہے اور اگرچہ ان کے حل ہونے

سے انسان کی کوئی مادی ضرورت بھی بظاہر پوری نہیں ہوتی، تاہم ہر معقول انسان کے فکر و ذہن پر ان کا اس قدر غلبہ ہوا کرتا ہے کہ آدمی اپنے بالکل پاس کے سارے سوالات کو چھوڑ کر سب سے پہلے انہی مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

بادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اگر گہری نگاہ سے انسان کا ذہنی و فکری تجزیہ کیا جائے تو اس امر واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں لیکن انسان اسی ترتیب سے سوچتا ہے اور اسی ترتیب سے وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سامنے پہلے یہ سوال نہیں آتا کہ اس کا جو جسم ہے وہ کن اجزا سے بنا ہوا ہے بلکہ پہلے وہ اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کو پیدا کس نے کیا ہے؟ اسی طرح اس کے ذہن میں پہلے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پانی وہ پی رہا ہے اس میں کن کن اجزا کی کتنی کتنی مقدار شامل ہے اور جو غذا وہ کھا رہا ہے وہ کن کن وٹامینی جوہروں پر مشتمل ہے بلکہ ان سوالات کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذات کون ہے جس نے اس کے لیے بلا استحقاق یہ خوانِ کرم بچھایا ہے اور اس ذات کی صفتیں کیا ہیں اور اس کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ علیٰ ہذا القیاس اس کے ذہن کو پہلے اس تحقیق کی خواہش پریشان نہیں کرتی کہ جس زمین پر وہ چل پھر رہا ہے وہ گول ہے یا چپٹی، ساکن ہے یا متحرک بلکہ سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس وسیع زمین کو اتنے عجائب کے ساتھ وجود میں کون لایا ہے اور وہ اس کو وجود میں لاکر خود کہاں چھپ کے بیٹھا ہوا ہے؟ وہ اپنے اوپر اس سقفِ نیلگوں کو اور اس کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر نہ تو اس بات کے دریافت کرنے کے درپے ہوتا کہ یہ جو ایک چھت سی اسے نظر آرہی ہے فی الواقع یہ چھت ہی ہے یا یہ محض ایک خلائے لامتناہی ہے، وہ دوربینیں لے کر چاند کے اندر نظر آنے والے دھبوں کی تحقیقات کے لیے دوڑتا ہے، نہ سورج اور زمین کے درمیان کے فاصلہ کی پیمائش کی فکر میں سرگرداں ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے اگر اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے حل کے لیے بیچین ہوتا ہے تو وہ یہ سوال ہے کہ وہ کون ہے جو اتنی حیرت انگیز چیزوں کو وجود میں لایا ہے اور ان چیزوں کے وجود میں لانے سے اس کا مقصد کیا ہے؟

انسان کے سوچنے کا یہ انداز اس کے وہمی پن کا یا محض اس کی ذہنی اپج کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اس کو پاس کی چیزیں چھوڑ کر دور کی کوڑی لانے کا کچھ شوق ہے۔ بلکہ فی الواقع سوچنے کی صحیح ترتیب ہی یہی ہے۔ یہی سوال درحقیقت وہ سوال ہے جس کے حل ہونے سے اس کی روح اور اس کی عقل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سلجھ سکتا ہے اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سر مارتا رہے لیکن وہ کسی ایک گرہ کو بھی نہیں کھول سکتا اور اگر کوئی گرہ کھولتا بھی ہے تو اس گرہ کے اندر سے ہزاروں گرہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سوال کو حل کیے بغیر اس دنیا میں انسان ہوائی جہازوں پر اڑنے اور ایٹمی آلات جیسی خطرناک چیزیں ایجاد کرنے کے باوجود بھی اس کائنات کے متعلق بالکل اندھیرے ہی میں رہتا ہے۔ وہ ایک گھر کے اندر ہے لیکن اس کو کچھ پتہ نہیں کہ یہ گھر کس کا ہے؟ وہ اس گھر کی مختلف چیزوں کو توڑ پھوڑ رہا ہے، ان کو الٹ پلٹ رہا ہے، ان کو اپنے استعمال میں لا رہا ہے لیکن اس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے یہ سارے تصرفات اس گھر والے کی مرضی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کی بے شمار نعمتوں سے آزادانہ متمتع ہو رہا ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں کہ ان تمام نعمتوں کے جواب میں اس گھر والے کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عاید کی گئی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کے ہر حصہ میں دندنا رہا ہے لیکن اسے کچھ علم نہیں کہ اس گھر والے کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس گھر کو گھر والے نے اس کو ہمیشہ کے لیے سونپ دیا ہے یا اس میں صرف اس کو چند دنوں کی عارضی سکونت کی اجازت دی ہے؟ اگر عارضی سکونت کی اجازت دی ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ہیں یا یہ حق تصرف بالکل بے قید و شرط ہے؟ اگر کچھ شرطیں ہیں تو وہ شرطیں کیا ہیں؟ اور اگر وہ شرطیں پوری نہ ہو سکیں تو گھر والا ان کے متعلق کوئی باز پرس بھی کرے گا یا نہیں؟

غور کیجیے کہ کیا کسی کودن سے کودن آدمی کی نسبت بھی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی عالیشان اور آراستہ و پیراستہ محل کے اندر جا اترے گا، اس کی ہر چیز سے بے تکلف فائدہ اٹھانا شروع کر دیگا، اس کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک کونے کی تحقیق و تفتیش شروع کر دے گا، اس کے مخفی خزانوں اور پوشیدہ دفینوں تک کی چھان بین کرنے لگ جائے گا اور وہ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے یہ دریافت

کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرے گا کہ اس محل کا مالک کون ہے؟ وہ اس کو اپنے محل کے اندر گھسنے دینے کا روادار بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر بالفرض وہ اس کو اس میں کچھ تصرف کرنے کی اجازت دے بھی رہا ہے تو اس پر اس نے کچھ پابندیاں اور شرطیں بھی عائد کی ہیں یا بغیر کسی پابندی اور بغیر کسی شرط ہی کے اس نے اپنا پورا محل اس کے حوالہ کر دیا ہے؟ ایک چور اور ایک نقب زن تو بلاشبہ کسی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑے بغیر اس طرح کے کسی محل میں جا گھسے گا اور اس میں من مانے تصرفات بھی شروع کر دے گا لیکن کسی شریف آدمی کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی اس قسم کی جسارت کر سکے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عاقل آدمی کے اندر سب سے پہلے اس کائنات کے متعلق یہ مابعد الطبیعی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں وہ عین اس کی فطرت کی جڑ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی سوالات ہیں جو پیدا ہونے چاہئیں اور انہی کے صحیح جواب سے دراصل اس کے روح و دل کو حقیقی طمانیت و مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور انہی سے علم حقیقی کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

جب آدمی کو اس کائنات کے خالق و مالک کا سراغ مل گیا تو اس کو گویا وہ کلید مل گئی جس سے علم حقیقی کے تمام دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے فکر کے لیے وہ نقطۂ آغاز مل جاتا ہے جہاں سے تحقیق و تفتیش کا صحیح قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انسان یہ سوال طے کر سکتا ہے کہ یہ دنیا کہاں سے آگئی ہے، اس کے بعد وہ خود اپنی حیثیت اور اپنے مرتبہ کو بھی متعین کر سکتا ہے، اس کے بعد وہ آفاق و انفس کے مطالعہ سے اس خالق و مالک کی صفتوں کا بھی علم حاصل کر سکتا ہے اور ان صفتوں کو خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے کسوٹی بھی بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے یہ سوال حل کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس کے لیے زندگی بسر کرنے کی پسندیدہ روش کیا ہے اور ناپسندیدہ روش کیا ہے۔ بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی سعادت و شقاوت اور قوموں کے عروج و زوال سے متعلق کیا اصول جاری ہیں۔

انسان کی انفرادی و اجتماعی سعادت سے متعلق یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو سب سے پہلے حل ہونے چاہئیں۔ ان کے حل ہو جانے کے بعد جہاں تک انسان کی عقلی و روحانی طمانیت کا تعلق ہے وہ اس کو حاصل

ہو جاتی ہے۔ رہی اس کی مادی و جسمانی آسائش تو وہ اپنی سعی و کوشش اور اپنے تجربی علم کے ذریعہ سے قدرت کے قوانین کے دریافت کرنے اور ان کو اپنے معاشی و تمدنی مصالح کی ترقی میں استعمال کرنے کا سلیقہ جس قدر بڑھاتا جائے گا اسی قدر اپنی معاشی خوشحالیوں میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم اس تفصیل سے ایک حد تک یہ بات تو واضح ہو گئی کہ حقیقی علم جس سے انسان کی روح اور اس کے دل کو طمانیت و تسلی حاصل ہوتی ہے اس کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے لیکن یہاں ہمیں مختصراً یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کی وضاحت اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہمارے اربابِ تصوف کے یہاں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے معاً آدمی کا ذہن خدا کی ذات اور اس کی تجلیات و انوار کے مشاہدہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن ہم اس لفظ سے ہرگز اس قسم کی کوئی چیز مراد نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سے خدا کے متعلق حرف مندرجۂ ذیل باتوں کا جاننا مراد ہے۔

(الف) تفصیلی دلائل کے ساتھ اس بات کا علم کہ خدا ہے۔

(ب) پوری وضاحت کے ساتھ خدا کی صفات کا علم۔

(ج) اس بات کا علم کہ وہ فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو پسند کرتا ہے اور فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔

(د) اس بات کا علم کہ دنیا میں وہ افراد اور جماعتوں کے ساتھ فلاں فلاں قوانین کے تحت معاملہ کرتا ہے۔

(ہ) اس بات کا علم کہ مرنے کے بعد بھی اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے اور وہ اپنے نیک اور بد بندوں کے ساتھ اس اس طرح کا معاملہ کرنے والا ہے۔

خدا کے متعلق اگر مذکورۂ بالا باتیں ایسے دلائل کے ساتھ معلوم ہو جائیں جو دل کے اندر اطمینان پیدا کریں تو اس کی معرفت کے لیے ان کے بعد کسی اور بات کے جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور اگر یہ باتیں ایک شخص کو معلوم نہ ہوں تو اگرچہ وہ اپنے خیال میں ہر آن تجلیات و انوار کا مشاہدہ کر رہا ہو لیکن درحقیقت

وہ خدا سے بالکل بے خبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس معرفت کے مدارج ہوتے ہیں، اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس معرفت کی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف عارفین کی معرفت میں فرق ہوا کرتا ہے، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معرفت کسی شخص کے لیے محض قال ہوتی ہے اور کسی کے لیے حال بھی بن جاتی ہے لیکن معرفت کے دائرہ میں بہر حال وہی چیزیں آتی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان سے آگے بڑھکر اگر انسان خدا کی ذات کا مشاہدہ یا اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہے یا ذات کی تجلیات و انوار دیکھنا چاہے تو یہ چیز اس کے امکان سے باہر ہے۔ انسان کو جو عقل ملی ہوئی ہے اس کی رسائی صرف خدا کی صفات ہی تک ہے، خدا کی ذات کا وہ کوئی تصور کر ہی نہیں سکتی، اسی طرح انسان کو جو حواس عطا ہوئے ہیں وہ صرف خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں ہی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ خدا کی تجلیات اور اس کے انوار کا مشاہدہ ان کی قوت برداشت اور ان کے تحمل سے باہر ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے متعلق بیان ہوا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ جب تک وہ ان کو ذاتِ الٰہی کا کھلم کھلا مشاہدہ نہیں کرائیں گے اس وقت تک وہ ان کی یہ بات ہرگز باور نہیں کریں گے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کرنے کے بجائے اس کو ان کی سرکشی اور حماقت کا نتیجہ قرار دیا اور ان کی اس گستاخی کی سزا میں اپنے جلال کی ایک ذرا سی نمود سے ان سب کو بیہوش کر دیا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (بقرہ - ۵۵-۵۶)

اور یاد کرو جبکہ تم نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہاری بات نہیں ماننے کے یہاں تک کہ ہم خود خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں تو تم کو کڑک نے آ دبوچا اور تم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تم کو تمہاری بیہوشی کے بعد اٹھایا تاکہ تم شکر گذار بنو۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ انسان کے لیے خدا کی ذات کا مشاہدہ بالکل محال ہے۔ وہ خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور اس کی آیتوں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انہوں نے خدا کی ذات

کا مشاہدہ کرنے کی تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ تم میری ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، میری تجلی کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لا سکتا تو تم کس طرح لا سکو گے، تم صرف میری نشانیوں کا اور میری صفات کے مظاہر کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ظاہر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ ۚ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي ۚ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۚ فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ

(۱۴۳ - اعراف)

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوا اور اس کے خداوند نے اس سے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے خداوند مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ اس نے جواب دیا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے ہاں پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے خداوند نے پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر کی تو اس کو پاش پاش کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو بولے کہ تو پاک ہے میں نے تیرے حضور توبہ کی اور میں پہلے ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

یہی بات احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

حجابه النور لو كشفه لاحرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه (مسلم)

اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اسکے چہرہ کے انوار سے وہ ساری مخلوق جل کے رہ جائے جہاں تک اسکی نظر پہنچے

اس سے معلوم ہوا کہ ذات الٰہی اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کی تاب حضرات انبیائے کرام بھی نہ لا سکے چہ جائیکہ عام لوگ۔ اس وجہ سے جو لوگ خدا کی ذات یا اس کی تجلیات کے مشاہدہ کے درپے ہوتے ہیں اور اس غرض کے لیے مجاہدے اور مراقبے کرتے ہیں ہمارے نزدیک وہ ایک سعی لاحاصل میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے بارہ میں یہ کہنا بھی کچھ بیجا نہ ہوگا کہ یہ لوگ درحقیقت اس گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں جس گستاخی کے مرتکب یہود ہوئے اور لازماً وہ اسی سزا کے بھی مستحق ہیں

جو سزا اس گستاخی پر یہود کو دی گئی۔

بعینہٖ یہی حقیقت مختلف طریقوں سے حدیثوں میں بھی سمجھائی گئی ہے کہ آدمی کو اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کے بارہ میں غور کرنے کی چھوٹ اسی وقت تک دینی چاہیے جب تک وہ اس کی صفات و آیات اور اس کی شانوں اور اس کے کرشموں پر غور کرے۔ جب وہ اس حد سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے شروع کر دے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ فوراً وہیں رک جائے اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگے۔ کیونکہ یہ سوالات اس کے ذہن میں شیطان کی وسوسہ اندازی ہی کے سبب سے پیدا ہو رہے ہیں اور ان کا نتیجہ حیرانی و درماندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور شیطان اس کو اس چکر میں صرف اس لیے ڈال رہا ہے کہ اس طرح اس کو کفر اور الحاد میں مبتلا کر دے۔ اسی حقیقت کو مندرجۂ ذیل حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاتی الشیطان احدکم فیقول من خلق کذا من خلق کذا حتی یقول من خلق ربک فاذا بلغہ فلیستعذ باللہ فلینتہ۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ سوال شروع کرتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی، فلاں چیز کس نے بنائی، یہاں تک کہ یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا۔ جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگے اور سوچنا بند کر دے۔

معرفت الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ معرفت الٰہی کی اہمیت اور اس کا اصلی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معرفت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اس مسئلہ پر غور کرنے والے مختلف گروہوں نے مختلف دیا ہے۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف تین گروہوں سے بحث کریں گے ایک فلاسفہ، دوسرے متکلمین، تیسرے صوفیہ۔ ان گروہوں کے اندر بھی اس سوال کے جواب میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کے سبب سے ان میں سے ہر گروہ مختلف فرقوں میں بٹ گیا ہے۔ ہم ان اختلافات سے قطع نظر کر کے اس بارہ میں عام فلاسفہ، عام متکلمین اور عام صوفیہ کی جو رائے ہے وہ اختصار کے ساتھ پیش

کرتے ہیں۔

فلاسفہ کی رائے | فلاسفہ خواہ قدیم ہوں یا جدید ان میں سے جو کسی نوعیت سے بھی خدا کے قائل ہیں (اور انہی سے یہاں بحث ہے) وہ خدا کی معرفت کے لیے انسان کی فطرت اور اس کی عقل کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیدا کرنے والے نے انسان کو عقل اور فطرت کی رہنمائی دے کر اس کو کسی مزید غیبی رہنمائی کی ضرورت اور اس کی مداخلت سے بالکل مستغنی کر دیا ہے۔ عقل کا چراغ ہر تاریکی میں اجالا کرنے کے لیے ان کے نزدیک کافی ہے۔ اس اندرونی ہادی کی رہنمائی حاصل ہو جانے کے بعد کسی معاملہ میں بھی انسان ان کے خیال میں اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ وہ الہام حاصل کرنے کے لیے اپنے سے کسی خارج رہنما کی طرف متوجہ ہو۔ ان کے نزدیک عقل انسان کے سارے طبیعی اور مابعد الطبیعی سوالات حل کر سکتی ہے اور اگر وہ نہیں حل کر سکتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری عقل ان سوالات کو حل کرنے کے قابل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ابھی ہماری عقل ترقی کے اس درجہ پر نہیں پہنچی ہے کہ ان سوالات کو حل کر سکے۔ عقل کی رہنمائی پر یہ اعتماد صرف انہی فلسفیوں نے نہیں ظاہر کیا ہے جو رسالت اور نبوت کے سلسلہ کے منکر ہیں بلکہ سلسلۂ نبوت و رسالت کے قائل فلسفیوں نے بھی عقل پر یہی اعتماد ظاہر کیا ہے۔ وہ بھی فلسفہ کے زیر اثر عقل کے ساتھ اس قدر حسن ظن رکھتے ہیں کہ اس کو انسان کی رہنمائی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب کے زیر اثر دبی زبان سے کسی حد تک نبی اور رسول کی رہنمائی کی ضرورت تسلیم کرتے بھی ہیں تو محض عوام کالانعام کے لیے۔ فلاسفہ اور حکما کو انبیاء کی رہنمائی کی احتیاج سے مستغنی کر دیتے ہیں۔

متکلمین کی رائے | اس کے بالکل برعکس نظریہ ہمارے متکلمین کی اکثریت (بالخصوص اشاعرہ) کا ہے۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور فطرت کو ان مابعد الطبیعی سوالات کے حل کے لیے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بالکل ناکارہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک عقل صرف انہی سوالات کا کچھ اُلٹا سیدھا حل معلوم کر سکتی ہے جن کا تعلق اس عالم محسوس سے ہے۔ اس عالم محسوس سے ماوراء حقائق تک پہنچنے کے لیے ان کے نزدیک عقل کے پاس کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ان معاملات میں انسان ایک عاقل مخلوق ہونے کے باوجود ان لوگوں کے نزدیک بالکل ایک مادر زاد اندھے سے مشابہ ہے جو چند قدم چلنے کے لیے بھی کسی عصا کش

کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اگر عصا کش نہ ہو تو ہر قدم پر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے۔ اسی وجہ سے عام فلاسفہ انسان کو کسی مافوق عقل رہنمائی سے جس شدت کے ساتھ بالکل مستغنی ثابت کرتے ہیں اس سے زیادہ شدت و قوت کے ساتھ یہ لوگ انسان کو اس مافوق عقل رہنمائی کا محتاج ثابت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان سارے سوالات کو، جو انسان کی زندگی سے حقیقی تعلق رکھنے والے ہیں، صرف خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی حل کر سکتے ہیں۔ عقل سے یہ لوگ اس قدر بدگمان ہیں کہ نہ صرف یہ کہ عقل ان سوالات کا کوئی حل دریافت نہیں کر سکتی بلکہ انبیاء ان سوالات کے جو حل بتاتے ہیں عقل ان کی قدر و قیمت بھی نہیں بتا سکتی۔ بلکہ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں میں عقل کو سرے سے کوئی دخل ہے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ خود نبی کے پہچاننے کے لیے بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی عقلی کسوٹی موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ نبی کو صرف اس کے معجزات کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں، اس کی تعلیم، اس کی حکمت اور اس کے اخلاق کو اس کے پہچاننے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلم اخلاقی اصولوں کے بارہ میں بھی عقل اور انسان کی فطرت کو کوئی فیصلہ کن معیار تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نظریہ کے لحاظ سے جھوٹ کی برائی اور سچ کی اچھائی بھی کوئی عقلی اور وجدانی شے نہیں ہے، انبیاء نے سچ کو اچھا کہا اس وجہ سے وہ اچھا ہے اور جھوٹ کو برا کہا اس وجہ سے وہ برا ہے۔ اگر وہ اس کے بالکل برعکس فیصلہ دے جاتے تو عقلی حیثیت سے جھوٹ کے اچھے ہونے اور سچ کے برے ہونے میں بھی کوئی قباحت ان کے خیال میں نہیں تھی۔

صوفیہ کی رائے | صوفیہ کے نزدیک خدا کی معرفت حاصل کرنے کا اصلی ذریعہ وجدان، کشف اور مشاہدہ ہے۔ ان لوگوں نے معرفت کا معیار اس قدر اونچا رکھا ہے کہ وہاں تک عقلی اور استدلالی علم کے پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جس علم کی بنیاد استدلال پر ہو وہ ان حضرات کے نزدیک ایک پائے چوبیں ہے اور اس پائے چوبیں کے ذریعہ سے معرفت کی منزل نہیں طے کی جا سکتی۔ ع پائے استدلالیاں چوبیں بود

مولانا روم نے اپنی مثنوی میں عقل کی نارسائیوں پر جو کچھ لکھا ہے اور جس زور سے لکھا ہے یہ ان کے اکیلے کی آواز نہیں ہے بلکہ انہوں نے درحقیقت صوفیہ کے ہر طبقہ کی ترجمانی کی ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کی یہ رائے صرف فلاسفہ اور حکماء ہی کے علم کے بارہ میں نہیں ہے کہ وہ معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے ناکارہ ہے اور اس کی حیثیت ایک پائے چوبیں کی ہے بلکہ وہ علم شریعت بھی جس کی بنیاد وحی پر ہے، ان حضرات کے نزدیک حقیقی معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اکابر صوفیہ علم شریعت کی تحقیر نہیں کرتے لیکن بہرحال اس کی حیثیت ان کی نظر میں "علم ظاہر" سے زیادہ نہیں ہے اور یہ "علم ظاہر" چاہے ان کے نزدیک تحقیر اور استخفاف کا مستحق نہ ٹھہرے تاہم اس کا مرتبہ ان کی نظر میں ان کے اپنے علم باطن کے برابر نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیوں نے ترنگ میں آکر علم شریعت کے بارہ میں ایسے الفاظ بھی استعمال کر دیئے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم باطن کے مقابل میں اس کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتے۔ مثلاً ایک شیخ تصوف کا ارشاد ہے کہ "ہم اپنا علم ایک ایسی ذات سے حاصل کر رہے ہیں جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والی نہیں اور تم اپنا علم ایک ایسے زندہ سے حاصل کر رہے ہو جسے ایک دن بہرحال مرنا ہے"۔ ایک دوسرے بزرگ سے کہا گیا کہ "آپ عبدالرزاق سے حدیث حاصل کرنے کے لیے سفر نہیں کرتے؟" جواب میں ارشاد فرمایا کہ "جو خود خلاق سے حاصل کر رہا ہو وہ عبدالرزاق سے کیا حاصل کرے گا"۔ ایک اور شیخ کا ارشاد ہے کہ العلم حجاب بین القلب و بین اللہ عزوجل "علم دل اور اللہ کے درمیان ایک حجاب بن جاتا ہے"۔ ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے اذا رأیت الصوفی یشتغل بحدثنا واخبرنا فاغسل یدك منه "جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حدثنا اور اخبرنا کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو"[1]

---

[1] یہ اقوال ہم نے مدارج السالکین ج ۲ ص ۲۳۹ سے لیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس علم کو قرآن مجید "العلم" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے کسی اور علم کے اتباع کو وہ اتباعِ ہوا اور اتباعِ ضلالت قرار دیتا ہے اس علم کی قدر و قیمت ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ کے نزدیک کیا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔ (البقرہ ۱۲۰)

اور اگر تم نے اس "العلم" کے بعد جو تمہارے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابل میں تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہ ہوگا۔

(باقی ص ۲۳۶ پر)

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کے جو مدارج ہیں اور جس علم کو وہ علم اور جس معرفت کو وہ معرفت کہتے ہیں ہم یہاں مختصراً اس کی وضاحت کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ دوسروں کے معیار علم و معرفت اور ان کے معیار علم و معرفت میں کیا فرق ہے اور اس علم و معرفت کے حاصل کرنے کے ان کے ہاں ذرائع کیا ہیں۔ اس وضاحت کے لیے ہم پانچویں صدی ہجری کے مشہور امام تصوف شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل ہروی حنبلی متوفی ۴۸۱ھ کی یادگار تصنیف منازل السائرین سے پہلے علم کی حقیقت اور اس کے مختلف مدارج کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم معرفت کی حقیقت اور اس کے مراتب پر ان کی رائے نقل کرینگے[1]۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۳۵) دوسری جگہ ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرہ۔ رکوع ۱۷)

اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کروگے بعد اس کے کہ تمہارے پاس العلم آچکا ہے تو تم اس وقت ظالموں میں سے ہوگے۔

لیکن ہمارے صوفیوں کا ایک طبقہ اس علم کو حجاب سمجھتا ہے اور اگر وہ کسی کو اس علم کی طلب میں مشغول پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ضائع ہوگیا۔ یہاں تک کہ صوفیوں کے نزدیک علم کی اصطلاح ایک حقیر اصطلاح بن گئی ہے اور جس چیز کو وہ علم حقیقی سمجھتے ہیں اس کو وہ علم کی اصطلاح کے بجائے معرفت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے لیے قرآن و حدیث کی استعمال کی ہوئی اصطلاح کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔

صوفیوں نے اپنے مخصوص علم کے لیے یہ جو مخصوص اصطلاح بنائی ہے، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالکین میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے اس کا سبب نہیں بیان کیا کہ آخر صوفیوں کو قرآن اور حدیث کی اصطلاح کو چھوڑ کر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

میرے نزدیک ان لوگوں کو اس نئی اصطلاح کے وضع کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ علم یا العلم کی اصطلاح علم وحی اور علم شریعت کے لیے معروف ہو چکی تھی اور اس علم کو یہ حضرات اپنے علم کے مقابل میں محض ایک علم ظاہر کی حیثیت دیتے تھے اس وجہ سے انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کے لیے یہ کوئی اور اصطلاح وضع کریں جس علم کو وہ علم شریعت سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں اور جو ان کے نزدیک علم حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے معرفت کی اصطلاح اختیار کر لی۔

[1] علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مدارج السالکین مطبوعہ مصر کے شروع میں منازل السائرین کا متن درج ہے (باقی ص ۲۳۷ پر)

شیخ الاسلام نے علم کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے :۔

(۱) وہ بدیہی علم جو آدمی کے حس و مشاہدہ میں آتا ہے یا جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہے یا جو سابق تجربات کی صحت پر مبنی ہے ۔

(۲) وہ علم خفی جو پاکیزہ جسموں کی پاکیزہ روحوں کے اندر نشوونما پاتا ہے، جو بے ریا ریاضت کے پانی سے سیرابی حاصل کرتا ہے، جو بلند ہمت اشخاص کے نفاس صادقہ کے اندر خلوت کے اوقات اور دنیا کے ہنگاموں سے نا آشنا کانوں میں ظاہر ہوتا ہے ۔

(۳) وہ علم لدنی جس کا وجود ہی اس کی سند ہے جس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے ۔

ان میں سے پہلے درجہ کے علم کی صوفیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے بھی اس کا ذکر بالکل ایک ابتدائی درجہ کی چیز کی حیثیت سے کیا ہے اور ایک لفظ بھی اس کے متعلق ایسا نہیں لکھا ہے جس سے ذرا بھی اس کی اہمیت واضح ہوتی ہو۔ حالانکہ علم شریعت بھی ان حضرات کے نزدیک اسی درجہ میں داخل ہے اس لیے کہ وہی علم ہے "جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہے"

دوسرے درجہ کے علم کے بارہ میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ "ھو علم یظھر الغایب و یغیب الشھادۃ و یشیر الی الجمع" یہ علم غیب کو ظاہر اور حاضر کو غایب کر دیتا ہے اور مقام جمع کی طرف رہبری کرتا ہے ۔

اس عبارت کی شرح اپنی طرف سے کرنے کے بجائے میں شیخ الاسلام کی کتاب کے سب سے بڑے شارح علامہ ابن قیم کے وہ الفاظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں جو انہوں نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"وھو یظھر الغایب" کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز عارف سے اوجھل ہوتی ہے یہ علم اس چیز کا کشف کر دیتا ہے "و یغیب الشھادۃ" سے یہ مراد ہے کہ یہ علم عارف کو اس کے مشہود حقیقی

(بقیہ حاشیہ نمبر ۲۳) میں یہاں اس کے مطالب اردو میں پیش کرونگا جو صاحب اصل عبارتیں دیکھنا چاہیں وہ مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کریں

کے سوا ہر چیز کے مشاہدہ سے بے خبر کر دیتا ہے۔" ویشیر الی الجمع" میں وحدانیت و فردانیت کے مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں تمام رسوم و قیود مٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ خود شاہد بھی اپنے آپ کو اس فردانیت میں گم کر دیتا ہے[1]۔

علم کا تیسرا درجہ جس کو شیخ الاسلام نے علم لدنی سے تعبیر فرمایا ہے درحقیقت یہی علم ارباب تصوف کے یہاں علم و معرفت کی حقیقی معراج ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے اس کی شان میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ "لیس بینہ وبین الغیب حجاب" علم لدنی اور غیب کے درمیان سرے سے کوئی پردہ حائل ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کی تعریف میں بھی شیخ الاسلام نے جو فقرے ارشاد فرمائے ہیں ان کی وضاحت بھی میں اپنی طرف سے کرنے کے بجائے بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کی تفسیر میں جو کچھ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے اسی کو یہاں درج کر دوں۔ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:۔

"اسنادہ وجودہ" اس کا وجود ہی اس کی سند ہے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس کے علاوہ جو علم[2] ہے اس کے حصول کا راستہ اسناد ہے اسی طرح اس علم کے حصول کا راستہ وجدان ہے۔ و ادراکہ عیانہ اس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم فکر اور استنباط سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کشف اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ونعتہ حکمہ جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ اپنی دلیل ہے اس کی دلیل کہیں اور سے نہیں لانی پڑتی۔ . . . . . وہ خود دلیل اور خود مدلول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔ بخلاف علم کی دوسری اقسام کے کہ ان کے درمیان اور غیب کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے۔ صوفیوں کے نزدیک اس سے مراد ایک نور ہے جو مشہود حقیقی کی طرف سے عارف کی طرف آتا ہے اور وہ اس کے حواس کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو مٹا کر عارف کے اندر خود ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر وہ مشہود حقیقی کو اسی نور کے ذریعہ سے دیکھنے لگتا ہے اور اس

---

[1] مدارج السالکین مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۴۴۲

[2] یہ اشارہ صاف علم شریعت کی طرف ہے۔

نور کے ظہور کے بعد مشہود حقیقی کے سوا عارف کی نظر میں سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔[1]

شیخ الاسلام کی اس پوری بحث پر ایک نظر دوبارہ ڈال کر وہ نتائج سامنے رکھ لیجیے جو اس سے نکلتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ سامنے آتی ہے کہ معرفت کے نقطۂ نظر سے صوفیائے کرام کے نزدیک علم شریعت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ علمِ شریعت جس کی بنیاد نقل و روایت پر ہے ان کے نزدیک بالکل ابتدائی درجہ کی چیز ہے۔ معرفت کے نقطۂ نظر سے جس علم کی اہمیت ہے وہ علمِ خفی ہے یا علم لدنّی۔

علمِ خفی اور علم لدنّی کو جس طرح نقل و روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح عقل و استدلال اور فکر و استنباط سے بھی ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سرتاسر وجدان، کشف اور مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں۔

ان کے حصول کا راستہ تعقل، تفکر اور استنباط و اجتہاد نہیں ہے بلکہ مراقبہ، توجہ، ریاضت اور خلوت گزینی ہے۔

یہ علم عارف کے حواس کو معطل کر کے خود اس کی جگہ لے لیتا ہے اور عارف کو تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے مشہود حقیقی کے اندر گم کر دیتا ہے۔

یہ علم غیب کے تمام پردے اٹھا دیتا ہے۔ اور عارف تمام حقائق کا گویا برای العین مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

اس بحث پر تنقید کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت اور اس کے مدارج پر شیخ الاسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کو بھی مختصراً ناظرین کے سامنے رکھ دیں، تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ معرفت کا معیار صوفیائے کرام کے نزدیک کیا ہے۔

سب سے پہلے شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ المعرفة احاطة بعين الشئ كما هو۔ معرفت کسی شئے کی حقیقت کا اس طرح احاطہ کر لینا ہے جیسی کہ فی الحقیقت وہ ہے۔

اس کے بعد علم کی طرح معرفت کے بھی شیخ الاسلام نے تین درجے قرار دیے ہیں اور لوگوں کو تین طبقات — عوام، خواص اور اخص الخواص — میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کی معرفت اس کے درجہ کے اعتبار

---

[1] مدارج السالکین ج ۲ ص ۲۴۳

سے الگ الگ بتائی ہے۔

معرفت کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ خدا کی جن صفات اور کرشموں کا مظاہرہ اس کی مخلوقات و مصنوعات میں ہو رہا ہے اور جن کا بیان نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہوا ہے، ان کی معرفت حاصل ہو۔ یہ معرفت عوام کی معرفت ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کی معرفت حاصل ہو اس طرح کہ ذات اور صفات کے درمیان کوئی تفریق نہ واقع ہو۔ یہ خواص کی معرفت ہے۔

معرفت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ خدا خود اپنی معرفت کا نور عارف پر ڈال دے اور عارف کی معرفت اس نور میں گم ہو جائے۔ اس معرفت تک نہ استدلال کی رسائی ہے، نہ اس تک کسی دلیل کی رہنمائی ہے اور نہ یہاں تک کسی وسیلہ کی پہنچ ہے۔ دل کا مشاہدہ، علم کے حدود و قیود سے آزادی اور مقام جمع کا مطالعہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ اخص الخواص کی معرفت ہے[1]

اب اس بحث کا جو خلاصہ نکلتا ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ لیجیے۔

معرفت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کی اصل حقیقت کا، جیسی کہ وہ فی الواقع ہے، احاطہ کر لیا جائے۔ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت جس کا ذریعہ انبیاء ہیں یہ ابتدائی درجہ کی معرفت ہے۔

معرفت کا اونچا درجہ درحقیقت معرفت ذات کا درجہ ہے۔

حقیقی معرفت جو اخص الخواص کا حصہ ہے وہ عقل و استدلال اور دلیل و شہادت سے ایک بالکل ماورا شے ہے۔ یہ معرفت جن کو حاصل ہو جاتی ہے وہ حقائق کو دلیل سے معلوم کرنے کے بجائے ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، وہ علم کے حدود و قیود سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور خود مشہود حقیقی کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔

تبصرہ اب ہم ان مختلف رایوں پر مختصراً تبصرہ کر کے یہ دکھائیں گے کہ ان میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا حصہ محض بے حقیقت خیال آرائی پر مبنی ہے۔

فلاسفہ اور متکلمین میں سے ہر ایک نے، جیسا کہ آپ نے دیکھا، ایک دوسرے کے بالکل ضد مسلک

---

[1] معرفت کی یہ پوری بحث منازل السائرین سے ماخوذ ہے

اختیار کیا ہے۔ ایک گروہ عقل کو اس قدر اچھالتا ہے کہ انسان کو بالکل آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور دوسرا اس کو اس قدر گراتا ہے کہ وہ بالکل تحت الثریٰ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقل کی رہنمائی پر اس قدر اعتماد رکھتا ہے کہ انسان کو کسی مافوق عقل رہنمائی سے بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی ثابت کر دیتا ہے، دوسرا عقل کو اس قدر ناقابلِ اعتماد ٹھیراتا ہے کہ انسان کو بالکل بے بصیرت اور اندھا بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ عقل نہ تو اس غیر معمولی احترام و اعتماد ہی کی مستحق ہے جس کا مستحق فلاسفہ نے اس کو گردانا ہے اور نہ اس توہین و تحقیر ہی کی سزاوار ہے جس کی سزاوار اس غریب کو متکلمین نے ٹھہرایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو سب سے بڑا انعام فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو عقل عنایت کی لیکن یہ عقل ایسی چیز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے بالکل کافی ہو اور اس کے بعد انسان کسی مافوق عقل رہنمائی کا محتاج نہ رہے۔ عقل تمام خوبیوں کے باوجود اپنے اندر متعدد ایسی خامیاں بھی رکھتی ہے کہ اس کی رہنمائی نہ تو کامل ہو سکتی نہ بے خطا۔ اوّل تو یہ جن حواسوں سے کام لیتی ہے ان کی رسائی ہی بہت محدود ہے اس وجہ سے بہت سے سوالات خصوصاً مابعد الطبیعی سوالات کے حل میں اس کے یہ وسائل و وسایط بالکل ہی ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ اپنے حواسوں کی فراہم کردہ معلومات سے جو کلیات ترتیب دیتی ہے اور پھر ان سے جو نتائج نکالتی ہے ان میں بھی وہ غلطیوں سے محفوظ نہیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی بھی کر سکتی ہے، وہ پست ہمت بھی ہو سکتی ہے، وہ مرعوب اور خوف زدہ بھی ہو سکتی ہے اور اپنے نفسانی میلانات و رجحانات کے حق میں جانب دار بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام انسانوں کی عقلوں کو جمع کر کے ان سب کی رہنمائی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انہی تقائص کی بنا پر جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اختلاف تو ان کے نتائج فکر میں لازماً رونما ہو کے رہے گا۔

تاہم عقل سے وہ مایوسی اور بدگمانی بھی بالکل غلط ہے جس کا اظہار متکلمین نے کیا ہے۔ عقل کی رسائی محدود ضرور ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ وہ مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے اور اخلاقی اقدار کی جانچ پرکھ کے معاملہ میں بالکل ہی کوری ہے ایک سخت قسم کا سفسطہ بلکہ ایک کھلی ہوئی جہالت ہے۔ عقل

اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باوجود ہماری رہنمائی بہت دور تک کر سکتی ہے۔ وہ اس کائنات کے مطالعہ اور اس کے اندر جو نظم و حکمت ہے اس کے مشاہدہ سے نہ صرف ایک خالق کا بلکہ اس خالق کی بہت سی صفتوں کا بھی اندازہ کر سکتی ہے، وہ خالق کی صفات سے خالق کی پسند اور ناپسند کے متعلق بھی ایک تصور قائم کر سکتی ہے، وہ اس دنیا کے نظام اور اس کے سنن و قوانین کے مطالعہ سے ایک روز جزا و سزا کا بھی خیال کر سکتی ہے، وہ انسانی فطرت کے اندر ودیعت کردہ اخلاقی یقینیات سے خیر و شر کے اصول بھی متعین کر سکتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے لیکن اس طرح نہیں کر سکتی کہ اس کے کیے ہوئے کو کامل سمجھا جا سکے یا اس کی صحت و صداقت پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکے۔ بس یہ خرابی اس کے کام میں ایک ایسی خرابی ہے جس کے سبب سے رہنمائی کے معاملہ میں تنہا اسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص ایسے معاملات میں جن پر انسان کی حقیقی طمانیت و مسرت اور اس کی انفرادی و نوعی سعادت و کامرانی کا انحصار ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ نے عقل پر جو اعتماد کیا ہے وہ بھی بالبداہت غلط ہے اور متکلمین نے اس کو جو بالکل خارج از بحث قرار دیا ہے وہ بھی صریحاً حقیقت کے خلاف ہے۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے۔

اب آیئے شیخ الاسلام[1] کے نظریات کا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ اس میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ ہم شیخ الاسلام کے خیالات کے اس حصہ کو زیر بحث نہیں لائیں گے جس میں کسی پہلو سے اختلاف رائے کی گنجائش ہے بلکہ ان کی صرف انہی غلطیوں کو سامنے لائیں گے جو بالکل واضح ہیں۔ ہمیں شیخ الاسلام کے نظریات پر مندرجۂ ذیل اصولی اعتراضات ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام نے شریعت کے علم کو کشف، مشاہدہ اور الہام کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے مقابل میں حصولِ معرفت کے نقطۂ نظر سے فروتر ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ یہ بات

---

[1] یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ نظریات تنہا شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل ہروی ہی کے ہیں۔ ہم نے شیخ الاسلام کو تمام اکابر تصوف کے ایک قابل اعتماد نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ جو نظریات شیخ الاسلام کے ہیں کم و بیش وہی نظریات دوسرے اکابر تصوف کے بھی ہیں۔ اور اگر کسی کے نظریات بنیادی طور پر شیخ الاسلام کے نظریات سے الگ ہیں تو اس کو تصوف کے زمرہ سے الگ سمجھنا چاہیے۔

بالبداہت غلط ہے۔ علم شریعت کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی میں کسی وہم، کسی وسوسہ، کسی نفسانی خیال آرائی اور کسی شیطانی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد وجدان اور کشف و مشاہدہ یا الہام وغیرہ پر ہو اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیونکہ کسی ٹبے سے بڑے عارف اور کسی بڑے سے بڑے صوفی کے متعلق بھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ شیخ الاسلام نے علم لدنی کے بارہ میں نہ صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ فکر و استنباط سے بالاتر ہے بلکہ اس کو بجائے خود دلیل کی حیثیت دے دی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صحت و صداقت کسی دوسری دلیل کی تصدیق و تائید کی محتاج نہیں ہے جس طرح ایک نبی کو وحی کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق و تائید کے لیے وہ کسی خارجی شہادت کا محتاج نہیں ہوتا اسی طرح ایک عارف اپنے وجدان یا اپنے کشف یا مشاہدہ یا الہام کے ذریعہ سے جو علم لدنی پاتا ہے اس کو بھی کسی اور کسوٹی پر اس کو جانچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شیخ الاسلام کے نزدیک "اس کا وجود ہی اس کی سند ہے"

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام کی یہ بات دین میں ایک شدید قسم کا فتنہ ہے۔ علم خفی ہو یا علم لدنی اس کو بجائے خود دلیل تسلیم کر لینے کے معنی تو یہ ہوتے کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور ان کے کشف و مشاہدہ اور ان کے الہام کو بالکل ہم پایہ وحی بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شخص کے لیے اسلام پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ کشف و الہام کے ذریعہ سے علم کے حصول کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ علم قابلِ قبول صرف اسی حالت میں ہونا چاہیے جب یہ شریعت کے مطابق ہو اگر یہ شریعت کے خلاف ہو تو لازماً یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اس کو قبول کر لینا دیدہ و دانستہ اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

اگر اس کشفی یا الہامی علم کو اس درجہ اہمیت دے دی جائے کہ یہ کتاب و سنت کی طرح بجائے خود دلیل بن جائے تو اس سے جس طرح کے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فیوض الحرمین سے ان کی ایک "تحقیق شریف" نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

تحقیق شریف - الاولیاء کثیرًا ما یلهمون بان الله تعالیٰ اسقط عنهم التکلیف وانه خیّرهم فی الطاعات ان شاؤا فعلوها وان لم یشاؤا لم یفعلوها - حکی لی سیدی الوالد رضی الله عنه عن نفسه انه الهم بهذا وانه دعا الله تعالیٰ ان یقیم علیه التکلیف وما اختار الا لتمس ولم یکن من مذهبه سقوط التکلیف عن احد من خلق الله ما دام عاقلا بالغا فرأیته یری الالهام حقا ویری مذهبه حقا وتحیر فی التطبیق - واخبرت عن سیدی العم قدس سره انه کان یخبر عن نفسه انه الهم بسقوط التکلیف وقیل له ان عبدت خوفًا من النار فانا قد اجرناک عن النار وان عبدت طمعا فی الجنة فانا وعدناک ان ندخلک ایاها وان عبدت طلبا لرضانا فقد رضینا عنک رضًا لا نسخط بعده فقال ربی انما اعبدک لا لشیٔ دونک - وکان قدس سره یمیل الی ان الکمل یسقط عنهم التکلیف والله سبحانه هو الذی یقیم علیهم النوامیس من غیر اختیارهم - هکذا روی عن کثیر من

ایک نہایت اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ بہت سے اولیاء پر یہ الہام کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام شرعی احکام کی تعمیل سے بری کر دیا ہے اور ان کو طاعت و عبادت کے معاملات میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں - مجھ سے میرے والد ماجد نے خود اپنے بارہ میں یہ بیان فرمایا کہ خود ان کو بھی اسی طرح کا الہام ہوا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ ان کے اوپر شرعی ذمہ داریوں کو قائم رکھے اور انہوں نے قوانین و احکام کی پابندی ہی کو اختیار کیا۔ ان کا مسلک یہ نہیں تھا کہ کوئی عاقل و بالغ شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جا سکتا ہے لیکن میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے اس الہام کو بھی حق سمجھتے ہیں اور اپنے اس مسلک کو بھی حق سمجھتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان تطبیق دینے میں ان کو کچھ حیرانی سی پیش آ رہی ہے۔

مجھے میرے عم بزرگوار کی نسبت بھی یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی اپنی بابت یہ فرماتے تھے کہ ان کو بھی شرعی ذمہ داریوں سے بریت کا الہام ہوا تھا۔ ان کو غیب سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر تم جہنم کے ڈر سے ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم نے تم کو جہنم سے پناہ دی اور اگر تم جنت کی آرزو میں ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو اس میں ضرور داخل کریں گے، اور اگر تم ہماری خوشنودی کی طلب میں ہماری

اولیاء اللہ تعالیٰ عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے ایسے راضی ہوئے کہ اب اس کے بعد کبھی ناخوش نہ ہونگے، تو انہوں نے کہا کہ اے رب میں تیری عبادت محض تیرے لیے کرتا ہوں کسی اور غرض کے لیے نہیں کرتا ہوں عم بزرگوار کا میلان اس بات کی طرف تھا کہ کاملین سے شرعی ذمہ داریاں ساقط کر دی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اوپر ان کے اختیار کے بغیر قوانین شرعی کو جاری رکھتا ہے۔ اور اسی قسم کی روایت دوسرے بہت سے اولیاء اور کاملین سے ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اس قسم کے الہامات کو رحمانی سمجھنے کا تعلق ہے شاہ صاحب کے والد بزرگوار اور عم بزرگوار دونوں حضرات ایک ہی رائے رکھتے تھے، البتہ ان دونوں بزرگوں کی رائیں اس بارہ میں مختلف تھیں کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بری کیا جاتا ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب کے والد ماجد کا مذہب یہ تھا کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بھی بری نہیں کیا جاتا لیکن ان کے عم بزرگوار کا مذہب یہ تھا کہ کاملین شرعی ذمہ داریوں سے بری تو کر دیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اختیار کے بغیر ہی ان کو تمام شرعی تکالیف کا پابند رکھتا ہے۔

خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بارہ میں اپنے عم بزرگوار کے مسلک کے موید معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عم بزرگوار کا مذکورہ بالا مسلک نقل کرنے کے بعد اس کا فلسفہ بھی مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

والستر فی ذالك عندی ان الانسان اذا انتقل عن الایمان بالغیب بهذه النوامیس الی الایمان بها علی بینة ووجد هذه العبادات والنوامیس فی نفسه مثل الجوع والعطش مما لا یقدر علی ترکه فلا معنی لتعلق التکلیف بها لانها من الجبلة التی جبل علیها۔[1]

میرے نزدیک اس کے اندر رمز یہ ہے کہ آدمی جب ان شرعی احکام پر ایماناً غائبانہ کے درجہ سے ترقی کر کے ایمان شہادت (ایمان علی بینہ) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان عبادات و احکام کی طلب اپنے اندر اسی طرح محسوس کرنے لگتا ہے جس طرح بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے جن کے چھوڑنے پر وہ قادر نہیں رہتا تو پھر ان چیزوں کا اس کو مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو اب اس کی جبلت بن چکی ہیں جن پر وہ پیدا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ اس قسم کے الہامات کو اپنے والد ماجد اور عم بزرگوار

---

[1] یہ عبارات فیوض الحرمین ص ۲۳، ۲۴ سے نقل کی گئی ہیں۔

کی طرح رحمانی سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کا ارشاد ہے والحق عندی ان الالہام کلہ حق[1] بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ کاملین جن کو ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالشہادۃ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے وہ شرعی تکالیف سے بری کر دیے جاتے ہیں۔ کیونکہ شرعی تکالیف ان کے لیے بالکل اضطراری نوعیت کی چیز بن جاتی ہیں جن سے انحراف ان کے لیے ممکن ہی نہیں رہ جاتا۔ جس طرح وہ طبعی قوانین کی مجبورانہ اطاعت کرتے ہیں اور جس طرح وہ بے بس ہو کر جبلی تقاضوں کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح وہ شرعی احکام کی بھی تعمیل بالکل بے بس ہو کر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو شرعی تکلیف کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس دلیل کی بنا پر کہ ان کاملین کے لیے شرعی احکام و قوانین جبلی تقاضوں کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو شرعی احکام کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں تو بعینہٖ اسی دلیل کی بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جب یہ کاملین ان شرعی احکام کی تعمیل پر جبلی طور پر مجبور ہیں تو ان کی ذمہ داریوں سے ان کو بری قرار دینے کے بھی کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ کسی چیز سے بری قرار دینے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اختیار موجود ہو، جب اختیاری سلب ہو چکا تو بری قرار دینا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو معذورین و مجبورین کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے سبب سے غیر مکلف سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ مرتبہ اسلامی شریعت میں کاملین کا نہیں بلکہ نابالغوں اور مجانین کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عذاب و ثواب اختیاری اعمال پر مرتب ہوتا ہے تو جب یہ اعمال ان کاملین کے لیے اختیاری باقی ہی نہیں رہے تو ان پر ان کو اجر و ثواب کس بات کا ملے گا؟

تیسری بات یہ ہے کہ انبیائے کرام کا ایمان قرآن کی تصریح کے مطابق ایمان علی بینہ ہوتا ہے چنانچہ حضرت نوح فرماتے ہیں اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ (۲۸-ہود) اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک بینہ پر ہوں۔ حضرت صالح فرماتے ہیں ان کنت علیٰ بینۃ من ربی (۶۳-ہود) حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں ان کنت علیٰ

---

[1] فیوض الحرمین ص ۲۴

بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ (۸۸ - ہود) لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی کے متعلق بھی کوئی ادنیٰ اشارہ نہیں اس بات کا نہیں ملتا کہ ان کو کبھی اس بات کا الہام ہوا ہو کہ ان کو شرعی تکالیف سے بری قرار دے دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کو برابر یہی تاکید ہوتی رہی کہ جو کچھ تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اس پر برابر جمے رہو اور سرمو اس سے تجاوز نہ کرنا۔ حالانکہ شرعی تکالیف اگر کسی کے لیے جبلی چیزیں بن سکتی ہیں تو وہ سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں لیکن جب وہ آخر دم تک مکلف رہے اور دوسروں سے زیادہ مکلف رہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ہمارے نزدیک اسی طرح کا الہام یا کشف کاہنین کو ہو تو سکتا ہے لیکن ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ الہام یا کشف رحمانی بھی ہو سکتا ہے۔ رحمانی کشف اور رحمانی القاء ہمیشہ بندہ کو صحیح سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ بندہ کو فتنہ میں نہیں ڈالتا۔ فتنہ میں ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ یہ کام رحمان کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں نبیوں اور رسولوں پر وحی نازل فرمائی لیکن یہ وحی ہمیشہ شرعی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی تاکید کے ساتھ نازل ہوئی، نبی کے لیے بھی اور اس کی امت کے لیے بھی۔ ہم کو ابتداء کو پورے گروہ میں سے کسی کے بارہ میں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کو ایک مرتبہ بھی وحی یا کشف کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا ہو کہ اب وہ شرعی فرائض اور ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اگر انبیاء کرام کی زندگیوں میں اس طرح کی کوئی چیز ملتی ہے تو اس کی نوعیت یا تو شیطانی وسوسہ کی ہے جس سے انہوں نے اللہ کی پناہ مانگی ہے یا پھر انسانی واہمہ کی ہے جس کی انہوں نے اصلاح فرمائی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ جب آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دے گئے تو آپ نوافل میں اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا افلا اکون عبدا شکورا "کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"؟

اگر کاملیت کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوتا کہ کامل کو شرعی تکالیف ہی سے بری قرار دے دیا جاتا تو سب سے بڑھ کر کامل اور اکمل تو حضور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی لیکن قرآن کی کسی آیت یا آپ کی کسی حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کو زندگی کے کسی دور میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کے لیے ہوا ہو کہ آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے کسی پہلو سے بھی سبکدوش کیا گیا ہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس کمال عبدیت میں آپ جتنے ہی آگے بڑھتے گئے شرعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی قدر بڑھتا گیا۔ ہم

یہاں چند آیتیں ایسی نقل کرتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی کے آخری دور میں اللہ کی بندگی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہونے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ سورہ الم نشرح میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ — پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی بندگی میں کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔

جس سورہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تاویل کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وفات کی پیشگوئی ہے عین اس سورہ میں آپ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔ — جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی احمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ایک جگہ صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ اپنے رب کی بندگی پر جمے رہو یہاں تک کہ موت آجائے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ — اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو یہاں تک کہ موت آجائے

تمام اہل تاویل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں یقین سے مراد موت ہے۔

بہرحال اس قسم کا القا خدا کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا، اگر ہو سکتا ہے تو شیطان کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ کاملین کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ آخرت کی فلاح و کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے انہوں نے کر لیا، اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کوشش میں اگر اس کو کچھ زیادہ کامیابی بالفرض نہ بھی ہو، صرف اتنی ہی کامیابی ہو جائے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنے عمل کو ذرا زیادہ اہمیت ہی دینے لگ جائے تو یہ بھی اس شخص کی آخرت کی بربادی اور شیطان کی بہت بڑی کامیابی ہے درا اہل تقویٰ اس فتنہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر شیطان کے اسی وسوسہ کو کوئی بزرگ اپنی سادہ لوحی سے سچ مچ القاء رحمانی ہی سمجھ بیٹھیں اور اس کی تعمیل میں تمام شرعی تکالیف سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیں تب تو سمجھیے کہ شیطان کو سو فیصدی کامیابی حاصل ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس قسم کے الہامی اور کشفی علوم کو بجائے خود

دلیل اور معیار قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی طرح بھی بچا نہیں جا سکتا۔ اسی چیز سے ہزارہا بدعات پیدا ہوئی ہیں اور اگر اس کا دروازہ کھلا رہے تو اس سے ہزارہا بدعات آئندہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ بہت سے مبتدع صوفیوں نے اسی قسم کے غیبی اشارات کو آڑ بنا کر اپنے آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دے لیا جس کے سبب سے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی انہوں نے گمراہ کیا۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

۳۔ اس علم لدنی کے متعلق شیخ الاسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیس بینہ و بین الغیب حجاب۔ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ جس کو علم لدنی حاصل ہو اس کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالبداہت قرآن کے خلاف ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اس کے سوا نہ کسی انسان کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو اور نہ کسی نبی کو نہ کسی ولی کو۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ نبیوں اور فرشتوں کا ہے لیکن قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے نہ براہ راست خطاب کر سکتے نہ غیب سے واقف ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ اگر ان سے خطاب کرتا ہے تو یا تو وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ان کے لیے سارے حجابات اٹھا دیے جائیں۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۵۱۔ زخرف) "اور کسی انسان کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے یا اس کے پاس وہ اپنا کوئی فرستادہ (فرشتہ) بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے اس کی طرف وحی کر دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اللہ بہت بلند اور حکمت والا ہے۔"

اسی طرح یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے بندوں کی مصلحت کے لیے اپنے کسی نبی یا رسول کو اپنے غیب کی باتوں میں سے کچھ باتوں سے باخبر کرے۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا "وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب سے کسی کو باخبر نہیں کرتا۔ ہاں اگر کسی رسول کو منتخب کرے تو اس کے آگے اور پیچھے اپنے پہرہ دار مقرر کرتا ہے۔"

انبیاء کی دعوت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ بلاتے

ہی انہی لوگوں کو ہیں جو عقل و استدلال سے کام لینے، آفاق و انفس میں خدا کی جو نشانیاں ہیں ان پر غور کرنے اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لیے بالکل بیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کے بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں۔ جو لوگ غیب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اللہ کو ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہیں قرآن میں ایک جگہ بھی ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دنیا میں مشاہدۂ غیب کو حکمتِ الٰہی کے بالکل خلاف اور اس قسم کے ایمان کو بالکل غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اصلی آزمائش ہی یہی ہے کہ آدمی مشاہدۂ غیب کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور انبیاء کی گواہی کی بنا پر حق کو مانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسا علم ہے جو غیب کے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور وہ اس دنیا میں انسانوں کو حاصل بھی ہو سکتا ہے تو اس کے پانے کے سب سے زیادہ مستحق حضرات انبیائے کرام ہی ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس علم سے آگاہ نہیں کیا حالانکہ ان کی قوموں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ رہا کہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو غیب کا مشاہدہ کرا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا کہ اس دنیا میں غیب کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جو چیز انبیاء کو نہیں عطا کی گئی اور جس کا دیا جانا حکمتِ الٰہی کے خلاف قرار دیا گیا وہ صوفیوں کو حاصل ہو گئی؟

یہاں اس قصہ سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو جو سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ اور خضر کا بیان ہوا ہے۔ خضر کو جو علم عطا ہوا تھا اس کے متعلق قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس علم نے ان کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے تھے اس سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ نکلتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند معاملات میں خضر کو اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ بنایا تھا اور ان کے اوپر ان معاملات کی حکمت بھی کھول دی تھی۔ جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے انہوں نے خضر کی باتوں کو جو گوارا کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان کے پاس ایک خاص امر کی تعلیم کے لیے جائیں۔ ان کا خدا کی طرف سے خضر کے پاس بھیجا جانا خود اس بات کی دلیل تھا کہ خضر خدا کے

خاص بندے ہیں، ان کا علم قابلِ اعتماد ہے اور ان کا عمل خدا کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے خضر کی ان باتوں کو جو ان کی نگاہ میں حق کے خلاف نظر آئیں محض اس وجہ سے گوارا کیا کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے خضر کے اوپر اعتماد کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر وحی کے ذریعہ سے ان کو خضر پر اعتماد کرنے کی ہدایت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت موسیٰ خضر کے ایک فعل کو بھی برداشت نہ کرتے۔ خود خضر نے بھی آخر میں حضرت موسیٰ کو یہی اطمینان دلایا کہ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنے جی سے نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر نے چند کام حضرت موسیٰ کے سامنے ان کو اس بات کی تعلیم دینے کے لیے کیے کہ خدا کے کام اگرچہ بظاہر کتنے ہی بے حکمت نظر آئیں لیکن ان کے اندر نہایت گہری حکمت ہوتی ہے جس کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اور یہ کام انہوں نے براہِ راست خدا کے احکام کے تحت اسی طرح انجام دیئے جس طرح فرشتے اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ جس طرح فرشتوں کو بناتا ہے اسی طرح کسی انسان کو بھی اگر اس نے کسی مصلحت کے تحت کسی وقت بنایا تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ لیکن اس چیز کو آڑ بنا کر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی اقدام شریعت کے خلاف کرے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا یہ فعل شریعت کے خلاف ہے تو وہ یہ جواب دے کہ میں نے یہ براہِ راست خدا کے حکم کے تحت اس کی مشیت کی تنفیذ کی ہے۔ کیونکہ دوسروں کے پاس اس کے صدق و کذب کے جانچنے کا ذریعہ وحی الٰہی ہی ہے اور وحی الٰہی آنحضرت صلعم کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ اب حق و باطل کی کسوٹی قرآن و سنت ہے۔ اگر کسی شخص کا فعل کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ اس عذر پر کتاب و سنت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا کہ اس نے یہ جو کچھ بھی کہا یا کیا ہے علم لدنی کی رہنمائی کے تحت کیا ہے اور یہ علم بجائے خود دلیل ہے، اس کو کسی اور کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ المعرفۃ احاطۃ بعین الشی کما ھو۔ معرفت یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کا جیسی کہ وہ ہے احاطہ کر لیا جائے۔ معرفت کی اس تعریف کی رُو سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی معرفت نہیں حاصل کی جا سکتی چہ جائیکہ خدا کی ذات اور اس کی صفات اور

اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو سکے۔ اس طرح کی معرفت ہم اُس ہوا کی بھی حاصل نہیں کر سکتے جس کے اندر سانس لیتے ہیں، اُس پانی کی بھی نہیں کر سکتے جس کو پیتے ہیں، اُس سورج کی بھی نہیں حاصل کر سکتے جس کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ جدید ہے کہ اس طرح کی معرفت اگر ہم خدا اپنے وجود کی بھی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ہمارے لیے محال ہے۔ اگرچہ ہمارے وجود سے زیادہ ہم سے قریب تر کوئی شے نہیں ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت ہم زمین پر رینگنے والی کسی ننھی سی چیونٹی کی بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر غور کیجیے کہ انسان جب اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی کما حقہٗ معرفت حاصل نہیں کر سکتا تو اس کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے جو ہمارے خیال و گمان اور قیاس و وہم سب سے بالکل بالاتر ہے۔ ع

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

۵۔ معرفت کی اس تعریف کے بعد ستم یہ ہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت کو بالکل ابتدائی درجہ کی چیز بتایا گیا ہے۔ معرفت کا دوسرا درجہ جو خواص کا حصہ ہے، ان حضرات کے نزدیک معرفتِ ذات سے شروع ہوتا ہے حالانکہ انسان خدا کی ذات کی کما حقہٗ معرفت تو درکنار اس کا سرے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کی صفات مثلاً سمع، بصر، علم، قدرت وغیرہ کا تصور تو انسان کچھ کر سکتا ہے (اگرچہ وہ کتنا ہی ناقص ہو) کیونکہ ان صفات کی ایک جھلک اپنے اندر بھی پاتا ہے لیکن خدا کی ذات کا تصور کرنے کے لیے تو اس کے تمام ذخیرۂ معلومات میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے جس قدر بھی بحث کی ہے خدا کی صفات، اس کے افعال اور اس کے قوانین و سنن سے کی ہے۔ اس کی ذات سے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ اور اس بات کی صاف تصریح کر دی ہے کہ اس دنیا میں انسان خدا کی ذات کی تجلی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ احادیث میں خدا کی ذات کے سوال پر غور کرنے کی ممانعت بھی کی گئی ہے کیونکہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے انسان کے پاس سرے سے کوئی ذریعہ ہے ہی نہیں۔ اگر وہ اس سوال پر غور کرے گا تو حیرانی و درماندگی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اور حیرانی و درماندگی بجائے اس کے کہ انسان کو کچھ دے اس سے وہ بھی چھین لیتی ہے جو اس کے پاس پہلے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا تو حضرات صوفیائے کرام کو بھی اقرار ہے کہ جس کو تجلی ذات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات فرائض و

واجبات بھی چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ہمارے نزدیک تجلی ذات اول تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کسی کو حاصل نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی شخص اس کے درپے ہو تو وہ کچھ پانے کے بجائے اُلٹے وہ بھی کھو آتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔

۶۔ معرفت کا تیسرا درجہ جس کو اخص الخواص کا حصہ قرار دیا گیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خالص وحدت الوجود کا تصور پیش کرتا ہے اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو علم کے حدود و قیود سے بالکل بالاتر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم سے مراد علم شریعت ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ علم شریعت نہ تو اس معرفت کا وسیلہ و ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس معرفت پر کوئی حکم ہی لگا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ ان حضرات کے نزدیک عارف ایک صاحب حال ہے اور ایک صاحبِ حال نے کشف اور مشاہدہ سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر مجرد ایک صاحبِ قال کو کوئی حکم لگانے کا حق نہیں ہے؛ ہمارے نزدیک یہ نظریہ بنیادی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارہ میں انسان کو اپنے جی سے کچھ کہنے کا حق نہیں دیا ہے بلکہ صاف صاف فرمایا ہے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتا ہے، انسان اس کو اپنے محدود ذرائع علم سے کما حقہ نہیں جان سکتا۔ اس وجہ سے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ظن و گمان اور اپنے کشف و مشاہدہ کی بنا پر خدا کے بارہ میں کچھ کہنے کے بجائے اللہ کی وحی کو رہنما بنائے اور اس کے بارہ میں وہی کچھ مانے جو خود اس نے اپنے متعلق بتایا ہے۔ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۷۴۔ نحل) "پس تم اپنے جی سے اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، اپنے آپ کو اللہ ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔" اگر کوئی شخص خدا کے بارہ میں کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جو خود خدا کے پیش کردہ تصور سے مختلف ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کو اپنے کشف یا مشاہدہ کے ذریعہ سے خدا کی یہی معرفت حاصل ہوئی ہے تو لازماً یہ ماننا پڑیگا کہ یہ شخص یا تو کسی وہم میں مبتلا ہے یا غلط بیانی کر رہا ہے۔

خدا کی معرفت کے بارے میں صحیح مسلک: اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خدا کی معرفت سے متعلق فلاسفہ، متکلمین اور اربابِ تصوف نے جو نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں ان میں سے ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ خلا ہے۔ اب ہم مختصراً بتائیں گے کہ خدا کی معرفت کا بالکل صحیح اور قابلِ اطمینان ذریعہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی معرفت کا صحیح اور قابلِ اطمینان ذریعہ انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن ہمارے اس کہنے کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ عقل و فطرت کو یا وجدان اور کشف کو معرفتِ الٰہی میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ عقل یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے اس میں غلطی اور وہم کے امکانات ہیں اور انبیاء کا طریقہ غلطی اور وہم کے تمام امکانات سے محفوظ ہے۔ انبیاء کے طریقہ کی بنا جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے عقل اور فطرت ہی پر ہے اور اس کے اندر

وجدان اور کشف کو بھی دخل ہے لیکن ان کے طریقہ میں چونکہ عقل یا وجدان تنہا کام نہیں کرتے بلکہ وحی الٰہی کی رہنمائی بھی ان کی مدد کرتی ہے اس وجہ سے اس طریقہ میں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ انسان کسی غلطی یا گمراہی میں مبتلا ہو سکے۔

انبیاء علیہم السلام کو جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وحی کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے اس علم کو قرآن کی اصطلاح میں "العلم" کہا گیا ہے۔ "العلم" یعنی علم حقیقی جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے، جو انسان کے لیے حقیقی صلاح و فلاح کی راہ کھولتا ہے، جو اس کے قلب اور اس کی روح کو سچی طمانیت اور سکینت بخشتا ہے، جو اس کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے اور اس کی آخرت کو بھی روشن کرتا ہے، جو ہر قسم کے اختلاط و التباس اور ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے، جس میں کسی قسم کے وہم یا وسوسہ کی کسی آمیزش کا اندیشہ نہیں ہے، جو ہر قسم کی شیطانی دخل اندازی سے بالکل محفوظ ہے، جس کو دینے والا خدا ہے، جس کو لانے والے جبریل امین ہیں اور جس کو دنیا میں پھیلانے والے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس کو دنیا میں اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی دونوں جگہ اس امر کا اہتمام فرمایا کہ نہ شیاطین الجن اس کے قریب پھٹک سکیں[1] اور نہ شیاطین الانس اس کے اندر کوئی خرابی پیدا کر سکیں[2] جس کی عظمت

---

[1] نزول وحی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کو ہر قسم کی شیطانی دسترس سے محفوظ کر دینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ آسمان کے اندر شیطانوں کی آمد و شد بند کر دی اور ان کو روکنے کے لیے نہایت مضبوط قسم کا پہرہ لگا دیا۔ سورۂ جن میں اس کا ذکر خود جنوں کی زبان سے یوں ہوا ہے۔ وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۸-۱۰ جن) اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو ہم نے پایا کہ اس کو سخت قسم کے پہرہ داروں اور شہاب ثاقب سے بھر دیا گیا ہے۔ اور ہم اس میں استراق سمع کے لیے گھات کی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو استراق سمع کے لیے گھات لگائے گا تو وہ ایک شہاب ثاقب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

[2] اسی طرح شیاطین الانس اللہ کے اتارے ہوئے علم اور اس کے دین میں جو گھپلا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کو روکنے کا بھی اس نے انتظام فرمایا۔ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطٰن ثم یحکم اللہ آیاتہ واللہ علیم حکیم (۵۲ حج) پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان ملانے کی کوشش کرتا ہے پھر اللہ اپنی آیتوں کو مستحکم کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اور پاکیزگی اور جس کے محافظین وحاملین کے صدق ووفا کی شہادت خود اس کے اتارنے والے نے ان الفاظ میں دی ہے:۔

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ ، مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ، بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کِرَامٍ بَرَرَةٍ (۱۳-۱۶- عبس)	گرامی صحیفوں میں، بلند اور پاکیزہ، باوقار اور باوفا منشیوں کے ہاتھوں میں ۔

جس کی معنوی قدر وقیمت کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی:۔

ان هذا القرآن حبل الله ، وهو النور المبين والشفاء النافع وعصمة من تمسك به ونجاة من تبعه	یہی قرآن اللہ کی رسی ہے، یہی نور مبین ہے اور شفاء نافع ہے، یہی اس کی پناہ ہے جو اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے۔ اور اس شخص کے لیے وسیلۂ نجات ہے جو اس کی پیروی کرے۔

جس کے بارہ میں حضرت علیؓ نے جو تمام ارباب تصوف کے نزدیک سب سے بڑے عارف ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی ہے ۔

قال اما انی سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول الا انها ستكون فتنة- قلت فما المخرج منها يارسول الله -قال كتاب الله فيه نبأ ما قبلكم وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم وهو الفصل ليس بالهزل، من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهدى فی غيره اضله الله وهو حبل الله المتين وهو الذكر الحكيم وهو الصراط المستقيم وهو الذی لا تزيغ به الاهواء ولا تلتبس به الالسنه ولا تشبع منه العلماء	فرمایا یاد رکھو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔ میں نے عرض کیا اس سے نجات کیا چیز دلائیگی یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا، اللہ کی کتاب۔ اس میں تمہارے اگلوں کی سرگذشت ہے، جو کچھ بعد میں آنے والا ہے اس کی خبر ہے اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا ہوگا اس کا فیصلہ ہے ۔ اور یہ ایک دوٹوک بات ہے کوئی ہنسی دل لگی نہیں ہے۔ جو سرکش اس کو چھوڑے گا اللہ اس کی پشت کی ہڈی توڑ دیگا۔ جو اس کے سوا کوئی اور مرجع ہدایت بنائے گا اللہ اس کو گمراہ کر دے گا۔

ولا یخلق علی کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہ وھو الذی لم تنتہ الجن اذ سمعتہ حتی قالوا انا سمعنا قرانا عجبا یھدی الی الرشد فآمنا بہ، من قال بہ صدق، من عمل بہ اجر، ومن حکم بہ عدل ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم (ترمذی)

خدا کی مضبوط رسی یہی ہے، حکمت سے بھری ہوئی کتاب یہی ہے، خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ یہی ہے، اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں نہیں گمراہ کرتیں اور زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں، علماء اس سے کبھی نہیں آسودہ ہوتے کتنی ہی پڑھو اس سے سیری نہ ہوگی، اس کے عجائب حکمت کبھی ختم نہیں ہوں گے، اس کے سنتے ہی جنات پکار اٹھے ہم نے عجیب وغریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے جس نے اس کی سند پر کہا سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا، جس نے اس کی مدد سے فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی دعوت دی۔

یہی علم ہے جس کے بارہ میں ہم اوپر انہی حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کر آئے ہیں۔

سئل علیؓ ھل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیئ دون الناس فقال لا والذی فلق الحبۃ وبرأ النمۃ الا فھما یوتیہ اللہ عبدا فی کتابہ۔

حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مخصوص علم ایسا بھی سکھایا تھا جو دوسروں کو نہ سکھایا ہو۔ آپ نے جواب دیا کہ نہیں اس ذات کی قسم جس نے تخم کو پھاڑا اور خلق کو پیدا کیا مجھے آپ نے اس قسم کا کوئی علم نہیں سکھایا۔ البتہ وہ فہم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کا کسی بندے کو عطا فرمائے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علم خاص جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت وحی الٰہی کے فہم ہی کا ثمرہ تھا اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں تھا۔

وحی الٰہی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ارباب تصوف کے علم خفی یا علم لدنی کی طرح عقل وفطرت سے بالکل ماوراء شے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے عقل اور فطرت ہی پر ہوتی ہے۔ قرآن کہیں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں جو تم سے کہی جا رہی ہیں ان کا وجود ہی

ان کی سند ہے یا یہ خود ہی دلیل اور خود ہی مدلول نہیں بلکہ وہ ہر جگہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل انہی باتوں کا مطالبہ کرتی ہے اور تمہاری فطرت ان کی صحت اور صداقت پر گواہ ہے۔ وہ ان چیزوں کو باقاعدہ منطقی طریقہ پر ثابت کرنے کے لیے آفاق اور انفس کے اندر سے دلیلیں پیش کرتا ہے اور اس خوبی اور اس وضاحت کے ساتھ ان کو ثابت کرتا ہے کہ کوئی ہٹ دھرم ہی ان کا انکار کر سکتا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ وحی الٰہی ہماری اپنی ہی فطرت کے مدفون خزانہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیتی ہے اور ہماری ہی عقل کو ہمارے اوپر گواہ بنا دیتی ہے۔ اگر یہ کام ہم خود کرتے تو اس میں غلطیوں کا امکان تھا اور یہ غلطیاں ہماری دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام وحی کے ذریعہ سے انجام دے دیا جو ہر شک و شبہ سے بالا ہونے میں اہل تصوف کے کشف و مشاہدہ سے کہیں ارفع ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس میں کما حقہٗ فہم و بصیرت حاصل کرے تو اس کو وہ نورِ یقین اور شرحِ صدر بھی حاصل ہو جائے جو اصل مقصود ہے۔ اور جس کو حاصل کرنے کے لیے صوفیہ طرح طرح کی ریاضت کر کے کشف اور مشاہدہ کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت علیؓ نے اپنے مذکورہ بالا قول میں اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیوں کے علم خفی یا علم لدنی کی طرح انبیاء علیہم السلام کا علم عقل کو مفلوج اور خیرہ نہیں بناتا بلکہ وہ تمام بنیادی معاملات میں رہنمائی کر کے عقل کو صحیح اور قطعی نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور اس طرح وہ اس کی ایسی تربیت کر دیتا ہے کہ بقیہ مسائل میں وہ آپ سے آپ صحیح طرز پر سوچنے لگ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار مخاطب کو تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی گئی ہے۔

تعقل کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات، شہوات اور خواہشات کو اپنا رہنما نہ بنا لے، اور نہ اوہام و خیالات کے ہاتھ میں اپنی باگ دے بیٹھے، بلکہ اس کے اندر خدا نے جو عقل رکھی ہے اس کو رہنما بنائے اور اس کی رہنمائی پر اعتماد کرے۔

تفکر کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ عالم کے قوانین و احکام اور فطرت انسانی کے مطالبات اور تقاضوں پر حکیمانہ طور پر غور کیا جائے اور ان سے زندگی کے لیے جو اصول پیدا ہوتے ہیں ان کو پوری

سچائی اور ایمانداری کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن بدیہیات پر یقین رکھتا ہے ان بدیہیات کو جذبات و شہوات کی ہلچل کے اندر بھی یاد رکھے اور پھر ان سے بالکل لازمی طور پر جو نتائج نکلتے ہیں ان کو بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تسلیم کرے۔

الغرض وحی الٰہی ہم کو خدا کی معرفت کی منزل تک ہماری عقل پر پٹی باندھ کر نہیں لے جاتی بلکہ وہ ہماری عقل ہی کو آفاق و انفس کے اندر خدا کی صفات اور اس کے سنن و قوانین کا مشاہدہ کراتی ہے اور پھر ان صفات اور ان سنن و قوانین سے جو اخلاقی اصول پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان سے زندگی کے لیے جو ضابطہ بنتا ہے ان کو ہمارے سامنے رکھتی ہے اور پھر اس سے جزا و سزا اور آخرت کے لیے جو رہنمائی ملتی ہے اس کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس طرح ہماری عقل ایک بالکل مامون ہادی کی رہنمائی میں خدا کی معرفت کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس کے اندر پہنچنے کی صلاحیت ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن حکیم ہے جو خدا کی معرفت کا اصلی ذریعہ ہے اور اسی کے تدبر سے انسان کو تعقل، تفکر اور تذکر کی وہ صحیح تربیت ملتی ہے جس سے انسان خداشناس اور خدارسی کا اہل بنتا ہے۔ اور اس راہ میں اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔